۶۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہنا چاہئے اور توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ ہر حال میں ہونا چاہئے اور خصوصاً دنیوی طاقت سطوت آنے کے بعد ان کی طرف زیادہ متوجہ رہنا چاہئے۔

۷۔ اسلام بھی دنیوی ترقی حاصل کرنے کے خلاف نہیں لیکن اس سلسلہ کا ہر قدم اسلامی ہدایات کے مطابق اٹھنا ضروری ہے خاموتی راہنمائی میں اٹھایا گیا ہر قدم سیدھی راہ سے دوری کرتا چلا جائے گا۔

۸۔ اسلام کی نظر میں عقل وفکر کا استعمال آزادی کے ساتھ کرنے کا حق ہر انسان کے لئے ہے اس میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا الا یہ کہ چھوٹے سے جب کسی ایسی بات کا اظہار ہوگا تو اس کو سراہا جانا بہت ضروری ہے تاکہ اس کی ہمت اس راہ میں مزید ترقی پذیر ہو لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں یہ بات الٹ ہو چکی ہے۔

۹۔ غیر نبی کے مقابلہ میں انبیاء کرام اور رسل عظام کا درجہ عظمت بہت زیادہ ہے اور یہ بھی کہ انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں ان کے متعلق کوئی ایسی بات بیان کی گئی ہو جو اخلاقیات سے گری ہوئی ہو تو اس کا صاف انکار کر دینا لازم وضروری ہے بشرطیکہ اس کا مفہوم اس کے سوا اور ممکن نہ ہو اگر مفہوم علاوہ مشہور ومعروف مفہوم کے ممکن ہو تو وہی بیان کرنا مفید مطلب ہے۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ قومی مناصب میں سے کسی منصب پر فائز کر دے تو اس منصب سے ذاتی فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے اور قومی فائدہ کو پیش نظر رکھنا ہر حال میں ضروری ہے خواہ اپنا ذاتی نقصان کر کے وہ حاصل کرنا پڑے اور اس بات کو ہر حال میں یاد رکھنا چاہئے اور اس معاملہ میں اپنا تجزیہ کرتے رہنا چاہئے۔

منہاج تحقیق

(نو آموز تحقیق کاروں کے لیے)

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

بنیادی اور ثانوی ماخذ کا فرق اور محقق کی مشکلات

بنیادی ماخذ (Primary Sources)

بنیادی ماخذ سے مراد وہ حقائق ہیں جنہیں بچشم خود دیکھا یا بہ اذن خود سنا جائے۔ جس طرح مرئی (Visible) اشیاء کے لئے چشم دید شہادت بنیادی ماخذ ہے اسی طرح سنی جانے والی آوازوں کے لئے اذن شنید گواہی بھی بنیادی ماخذ ہے۔ البتہ مرئی اشیاء کی گواہی میں سماعت کو بنیادی ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شاید اسی لئے کہا جاتا ہے۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

متنی تحقیق میں کسی مطبوعہ کتاب کی اشاعت اول کے نسخے (Copies) بھی بنیادی ماخذ میں شمار ہوتے ہیں۔ جیسے راقم الحروف کی کتاب "اصول تفسیر وتاریخ تفسیر" کے نسخے ¹ البتہ متعدد اشاعتوں کی صورت میں وہ نسخہ بنیادی سمجھا جائے گا، جسے مصنف نے نظر ثانی یا نظر ثالث کے بعد صحیح قرار دیا ہو ۔۔۔۔۔۔ اور قلمی کتاب کے نسخوں میں نقد داخلی وخارجی کے بعد جو نسخہ مستند قرار پاتا ہے، اسے بنیادی ماخذ سمجھا جاتا ہے۔

جے۔ لیونرڈ بیٹس (J. Leonard Bates) کے بقول بنیادی ماخذ دو قسموں میں منقسم ہیں۔

قسم اول میں (1) ذاتی کاغذات (2) دستاویزی ریکارڈ (3) انٹرویوز (4) متفرقات شامل ہیں۔

قسم دوم میں (1) مرکزی حکومت کی مطبوعات (2) صوبائی حکومت کی مطبوعات (3) خود نوشت سوانح عمریاں اور یادداشتیں (4) مجموعہ ہائے خطوط، تقریرات (5) اور معاصر مضامین شامل ہیں۔ 2*

ثانوی ماخذ (Secondary Sources)

ثانوی ماخذ سے مراد وہ معلومات و اطلاعات ہیں جنہیں بچشم خود نہ دیکھا جائے یا بہ آذان خود نہ سنا جائے۔ یہ ان افراد کے فراہم کردہ ریکارڈز ہوتے ہیں جو خود شریک واقعہ نہیں ہوتے بلکہ کسی شریک واقعہ فرد کی روایات پر ریکارڈ تیار کرتے ہیں۔

مصنف، جب کسی تصنیف کا حوالہ یا اقتباس دیتا ہے تو اسے بھی ثانوی اور بالواسطہ ماخذ شمار کیا جاتا ہے۔ ہر چند وہ حوالہ یا اقتباس مصنف کے لئے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہو۔ جیسا کہ پیچھے حاشیہ میں ایم سلطانہ بخش کی مرتبہ کتاب کا ریفرنس مذکور ہوا۔ جب کہ راقم کے لئے ہے۔ لہٰذا اقتباس کا حوالہ ثانوی اور بالواسطہ ماخذ ہے۔

یونہی کسی کتاب کا ترجمہ، خواہ وہ کتنا ہی اہم اور ضروری کیوں نہ ہو، ثانوی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ جیسے جلال الدین سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن کا اردو ترجمہ 3* وقس علیٰ ھذا۔

علاوہ ازیں ذرائع ابلاغ میں اخباری صحافت، ریڈیائی صحافت، اور ٹیلی ویژن صحافت کے ذریعے شائع، نشر یا ٹیلی کاسٹ ہونے والی خبریں اپنے قارئین، سامعین اور ناظرین کے لئے ثانوی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ جب کہ یہی ثانوی ماخذ، ذرائع ابلاغ میں امور متعلقہ سے وابستہ افراد کے لئے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ گویا نوعیت بدل جانے سے ماخذ کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی بنیادی ماخذ، ثانوی میں اور ثانوی ماخذ، بنیادی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بنیادی اور ثانوی ماخذ کے فرق کی مثال

بنیادی اور ثانوی ماخذ کے فرق کی مثال یوں دی جا سکتی ہے۔

ایم سلطانہ بخش اور محمد طفیل ہاشمی کی تحریر کردہ نصابی کتب 4* کہ جنہیں (نصابی کتب ہونے کے ناطے) ثانوی ماخذ میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی محقق ایم۔ فل اسلامیات کے ان "مطالعاتی رہنماؤں" پر کسی قسم کا کوئی کام کرے تو یہی نصابی کتاب ثانوی کی بجائے بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کر جائیں گی۔

ریکارڈز اور آثار

دستاویزی تحقیق میں کئی قسم کے ریکارڈز آثار (Remains) سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

وان ڈیلن (Van Dalen) کے حوالے سے وہ ریکارڈز اور آثار یہ ہیں۔

(1) سرکاری ریکارڈز ------------ مثلاً مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کی دستاویزات جیسے آئین، قوانین، چارٹرز اور عدالتی رودادیں وغیرہ۔

(2) ذاتی ریکارڈ -------- مثلاً ڈائریاں، خود نوشت سوانح عمریاں، خطوط، وصیت نامے، جائیداد کے کاغذات، معاہدات اور لیکچر کے اشارات۔

(3) زبانی روایات (Oral Traditions) ------ مثلاً اساطیر، لوک کہانیاں، خاندانی کہانیاں، تمثیلیں، تجربات اور واقعات

(4) تصویری ریکارڈ -------- مثلاً تصویریں، متحرک تصویریں، مائیکرو فلمیں، مصوروں کے نمونے، سکے اور مجسمے

(5) مطبوعہ مواد ---------- مثلاً اخبار، کتابچے اور رسالے۔

(6) میکانکی ریکارڈز ------ مثلاً انٹرویوز اور اجلاس۔

(7) آثار (Remains) ----- مثلاً آثار قدیمہ کی دستاویزات۔

(الف) مادی آثار -------- مثلاً عمارتیں، فرنیچر، ساز و سامان، ملبوسات اور اوزار و آلات۔

(ب) مطبوعہ آثار ------- مثلاً نصابی کتب، معاہدات، حاضری کے فارم اور اخباری اشتہارات۔

(ج) قلمی اداد ------- مثلاً مخطوطات۔ پیپرز، ایسی تختیاں (اینٹیں) جنہیں خط میخی میں تحریر ہوتی ہے۔ چمڑے پر لکھے ہوئے مخطوطات اور جدید دور کی ٹائپ کی ہوئی دستاویزات نیز مصوری کے نمونہ جات۔

(8) متفرقات ----- مثلاً فن کے مختلف نمونے اور یادگاریں 5*

تاریخی تحقیق کے سلسلہ میں بشا اور ہارٹر (Busha and Harter) نے جن مصادر و ماخذ کو بیان کیا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) سالنامے --------- جیسے کتب خانوں یا دیگر اداروں کی سالانہ رپورٹیں۔

(۲) آرکائیوز (Archives) --------- جیسے پبلک اور سرکاری دستاویزات۔

(۳) کیٹلاگ (Catalogue) --------- جیسے اشیا یا کتب کی مکمل فہرست جو عموماً وضاحتی

نوعیت کی ہوتی ہے۔

(۴) کرانیکل (Chronicale)-------حقائق و واقعات کا زمانی اعتبار سے ریکارڈ، جس کا تجزیہ و توجیہ و توضیح نہیں کی ہوتی۔

(۵) وثیقہ--------جیسے جائیداد کی منتقلی کا ریکارڈ۔

(۶) قصے کہانیاں (Legend)-------مثلاً روایتی یا افسانوی نوعیت کے غیر معمولی واقعات۔

(۷) مخطوط (M s)--------مثلاً خطوط، تاریخیں، روزنامچے، رسیدیں، ذاتی حالات، فہرستیں، اجلاس کی رودادیں، معاہدے، مجلس کے ریکارڈز، قانونی سندات (مثلاً متعلقہ پیدائش و اموات و شادی وغیرہ)

(۸) یادداشت (Memoiry)

(۹) یادگار (Memorial)

(۱۰) اسناد حقوق و مراعات (Mumiment)-------مثلاً کسی جائیداد کے استحقاق کی شہادت موجود ہو یا حقوق و مراعات کے مطالبے کی شہادت موجود ہو۔

(۱۱) رجسٹر (Register)

(۱۲) رول (Roll)

(۱۳) شیڈول (Schedule) 6*

حصولِ مواد کے ذرائع:

دستاویزی تحقیق میں حصولِ مواد کیلئے درج ذیل ذرائع سے مدد لی جاسکتی ہے۔

(۱) حوالہ جاتی کتب (۲) کتب خانوں کی فہرست کتب (۳) رسائل و جرائد کے اشاریات (۴) کتابیات (۵) تاریخی مواد سے متعلق تبصرے (۶) تحقیقی مقالات و رسائل (۷) مقامی کتب خانوں کی دستاویزات (۸) شعبہ جاتی کتب خانے (۹) مرکزی لائبریری (۱۰) جامعاتی کتب خانے (۱۱) عوامی کتب خانے (۱۲) دانشوروں کے ذاتی کتب خانے (۱۳) عجائب گھر (لاہور) (۱۴) نیشنل میوزیم (کراچی) (۱۵) آرکائیوز (i) پنجاب آرکائیوز (لاہور) (ii) نیشنل آرکائیوز (اسلام آباد) (۱۶) پرانی کتابوں کی دکانیں (۱۷) دانشوروں سے انٹرویوز (۱۸) ذاتی فائلیں (۱۹) خط و کتابت (۲۰) یادداشتیں (۲۱) خطبات کے اشارات

(Notes)، (۲۲) عظیم قومی شخصیات کی رہائش گاہیں، جنہیں ان کی وفات کے بعد میوزیم میں بدل دیا جاتا ہے۔ جیسے علامہ اقبال میوزیم (لاہور)، قائد اعظم میوزیم (کراچی) (۲۳) اخبارات وغیرہ۔

تلاش و تفحص میں تحقیق کار کو بڑے صبر آزما اور مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مطلوبات کی جمع آوری میں تخیل، جوہر، صبر اور مستقل مزاجی کو کامیابی کی کلید گردانا جاتا ہے۔

دستاویزی تحقیق میں تنقید کا مرحلہ تحقیق کار کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تنقید خارجی اور داخلی ہر دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے۔

خارجی تنقید / خارجی جانچ پرکھ

(External Criticism / Appraisal)

خارجی تنقید سے مراد یہ ہے کہ جمع کردہ دستاویز کی اصلیت جانی جائے۔ اس کے لئے مصنف، مقامِ تصنیف، سنِ تصنیف کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے۔ مثلاً کیا دستاویز کا مصنف وہی ہے جو معرضِ تحریر میں لایا گیا ہے یا کوئی اور؟ مقامِ تصنیف، جو درج کیا گیا ہے، مصنف کا اس جگہ سے کس نوعیت کا تعلق ہے؟ سنِ تصنیف جو اس پر درج کیا گیا ہے، وہ حق بر صائب ہے یا نہیں؟

الغرض تنقید خارجی کے لئے بیسیوں سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ جن کے تسلی بخش جواب کے لئے ظاہر ہے کہ تحقیق کار کو بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ 7*

داخلی تنقید / داخلی جانچ پرکھ

(Inte rnal Criticism / Appraisal)

دستاویزی تحقیق میں خارجی تنقید کے بعد داخلی تنقید کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں دستاویز میں مندرجہ بیانات کو خطا و صواب کے اعتبار سے دیکھا جاتا ہے۔ پھر ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ داخلی تنقید کا بیشتر حصہ متنی تنقید ( ) ہوتا ہے۔ تاہم اس میں مصنف کی اہلیت، دیانت، میلانِ خاطر، اور رجحان ذہنی بھی زیر بحث آتے ہیں۔

داخلی تنقید کے بارے میں گولڈ رنگ رائے یہ ہے۔

"داخلی جانچ پرکھ کا تعلق مصنف کی اہلیت اور دیانت سے ہوتا ہے۔ اس دائرے میں وہ عہد بھی آتا ہے۔ جس میں دستاویز تیار ہوئی ہم مصنف کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کیا اس کا رویہ عام طور پر خلوص پر مبنی تھا یا وہ متعصب تھا؟ کیا وہ صاحب علم اور باصلاحیت تھا؟ کیا وہ سچائی کو جاننے کی

پوزیشن میں تھا؟ کیا وہ صحیح صحیح، واضح انداز اور غیر جانب داری سے رپورٹ کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے؟ اس نے کس مقصد کے لیے دستاویز کو تیار کیا؟ کسی تاریخی واقعہ کا بہترین ریکارڈ وہ ہوتا ہے، جس میں خود غرضی، جہالت، اور تعصب کا کوئی عنصر نہ پایا جائے۔ 8*

خلاصہ:

خلاصتاً کہا جاسکتا ہے کہ بنیادی اور ثانوی ماخذ کی تفریق کا علم تحقیق کار کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ عموماً وہ ثانوی ماخذ سے بنیادی ماخذ کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ اس مراجعتی سفر میں اسے بڑے صبر آزما اور کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاہم عزم صمیم اور مستقل مزاجی اس کا دست و بازو بنتے ہیں۔ جن کے سہارے وہ داخلی اور خارجی نقد و نظر کا مرحلہ بھی خوش اسلوبی سے طے کر لیتا ہے اور نتیجتاً تحصیل حق (یعنی تحقیق) سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

تحقیقی منصوبے کا خاکہ اور اس کی تیاری

تحقیق کسی بامقصد سائنس اور منضبط فکر کے عمل اور اس کی پیشکش کا دوسرا نام ہے، جو بعض مخصوص مراحل کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ وہ بعض مراحل یہ ہیں۔

(۱) انتخاب موضوع (۲) موضوع کی وسعت کا تعین (۳) مواد کی فراہمی (۴) تجزیہ مواد (۵) نتیجہ تحقیق

بعض محققین نے جو ان امور کی تعداد زیادہ بتائی ہے، وہ اس سبب سے ہے کہ مختلف ماہرین تحقیق نے ان میں سے بعض کو کئی کئی شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے یوں ان کی تعداد بڑھ گئی ہے۔

بعض نے انتخاب موضوع کو یوں عنوانات تقسیم کیا ہے۔

(۱) سرچشمہ موضوع (۲) دلچسپی اور ذوق عمل (۳) انتخاب موضوع کا معیار

یونہی وسعت موضوع کے تعینات میں متعدد مضمرات کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اصل موضوع یا متعلقہ موضوعات کا تجزیہ

(۲) مطالعہ کی حدود اور دائرہ عمل کا تعین

(۳) موضوعات کی تفصیلات

(الف) تاریخی پس منظر قریب یا بعید

(ب) گذشتہ تحقیق اور متعلقہ مطالعہ کی تفصیل

(ج) گذشتہ مطالعہ کا تجزیہ

(د) مجوزہ طریقہ تحقیق

(ہ) ممکنہ نتائج

(۴) موضوع کی اصلیت

(۵) موجودہ طریقہ ہائے تحقیق

(۶) طے شدہ مفروضات کا بیان

(۷) متعلقہ شعبہ کے لیے کئے گئے کام کا جائزہ

(۸) متعلقہ ذخیرہ الفاظ کی وضاحت

اسی طرح فراہمی مواد کے حوالے سے درج ذیل ضمنی عنوانات قائم کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) مواد

(الف) انفرادی مواد۔ یہ مواد کی غیر سائنسی قسم ہے۔

(ب) معروضی مواد۔ یہ مواد کی سائنسی قسم ہے۔

(ج) علاقہ جاتی مواد۔ یہ مواد کی سائنسی قسم ہے۔

(د) صفاتی مواد۔ اس میں عمومیت ہے لیکن اس کی تلاش دشوار ہے۔

(۲) کتابیات

(۳) حصول مواد کے وسائل

مثلاً لائبریری۔ دستاویزات۔ تحقیقی مقالات۔ فہرست کتب۔ حوالہ کتب

(۴) حلقہ عمل

(۵) تحقیقی رسائل

(۶) بنیادی اور ثانوی وسائل

(۷) مواد کی درجہ بندی

موضوع کا انتخاب:

تحقیق کا مرحلہ اولین "موضوع کا انتخاب" ہے۔ یہ انتخاب، تحقیق کار کو خود کرنا چاہیے۔ جو اس کی اپنی صلاحیت، ذوق اور پسند کی روشنی میں ہو۔ دراصل محقق کا فطری ذوق عمل، انتخاب موضوع کیلئے بہت ضروری ہے۔ بصورت دیگر اس کی تحقیق خود اس کے لئے وبال جان بن سکتی ہے۔ یا غیر احمد ان بخش

ثابت ہو سکتی ہے۔

راقم نے بعض ایسے تحقیق کار دیکھے ہیں، جنھیں تحقیق سے منسوب دیکھ کر صرف غصہ آتا ہے بلکہ ان کے نتیجۂ موضوع پر رحم بھی آتا ہے۔ سچ کہا ہے ڈاکٹر ش۔ اختر نے۔

"جیسے ایک کم شعر، موزوں نہیں پڑھ سکتا، وہ عموماً شعرائے کرام کے دیوان کی تدوین میں لگ جاتا ہے اسی طرح جسے علم لسانیات سے کوئی دلچسپی نہیں وہ لسانیات کو موضوعِ تحقیق بنا لیتا ہے۔" 9

تحقیق کے موضوع کے انتخاب میں خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا دائرہ تحقیق نہ تو بہت محدود ہو اور نہ ہی وسیع، بلکہ دونوں کے بین بین ہو تاکہ تحقیق، وقتِ معینہ پر مکمل ہو سکے۔

امریکی فلاسفر (Charles Peirce) نے حصولِ علم کے چار اہم طریقے درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کیے ہیں۔

(۱) Method of Tenacity

(۲) Method of Authority

(۳) Method of Intution

(۴) Method of Science 10

بقول ڈاکٹر ش۔ اختر کے، خاکہ (Synopsis) بناتے وقت مندرجہ بالا طریقہ ہائے حصولِ علم کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ خاکہ دراصل ریسرچ ورک کی پہلی منزل ہوتا ہے، جس کی صورت گری میں دیباچے کو تقدم حاصل ہے۔

دیباچہ

بعض محققوں کے نزدیک "تعارف" اس کا متبادل ہے۔ باعتبارِ تحریر یہ مقالہ کا آخری حصہ ہوتا ہے۔ جب کہ ترتیبِ مقالہ میں اسے "پہلا باب" بنایا جاتا ہے۔ یہ باب درج ذیل مضامین پر محتوی ہوتا ہے۔

(الف) تعارف (ب) دائرہ (ج) پس منظر (د) مقصد

دیباچہ لکھتے وقت یہ امر پیشِ نظر رہے کہ وہ نہایت خوب صورت انداز میں لکھا جائے۔ کیونکہ مقالہ اگر ہمارا جسم ہے تو دیباچہ اس کی روح۔ یہی دیباچہ ہی قاری کو قراءتِ مقالہ پر آمادہ کرتا ہے۔

ضروری امور

ہر تحقیقی منصوبہ کا خاکہ درج ذیل ایسے امور کا متقاضی ہوتا ہے جس میں

(۱) موضوع سے متعلق مسائل کی تشریح کی گئی ہو۔

(۲) مطالعہ کی ضرورت اور مقصد کی وضاحت کی گئی ہو۔

(۳) موضوع اور مسائل کی اہمیت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہو، جس میں داخلی جذبات و احساسات کی جگہ سائنسی نقطہ نظر کو بنیاد بنایا گیا ہو۔

(۴) سابقہ تحقیق کا (اگر کی گئی ہے) حوالہ دے کر اپنی تحقیق کو پچھلی تحقیق سے آگے کی منزل قرار دیتے ہوئے اس کی ضرورت بیان کی گئی ہو تاکہ مقصدِ تحقیق اچھی طرح واضح ہو سکے۔

(۵) تحقیق کا طریقہ کار بیان کیا گیا ہو۔

(۶) خاکہ میں ابواب کی تقسیم منطقیانہ کی گئی ہو تاکہ ربط و تسلسل کا پتہ چل سکے۔

(۷) کتابیات کو شامل کیا گیا ہو (یہ خاکہ کا اہم حصہ ہوتا ہے)

(۸) ضمیمہ بھی ذکر کیا گیا ہو۔ (البتہ اس کی ضرورت موضوع کے اعتبار سے پڑتی ہے)

(۹) اشاریہ کو جگہ دی گئی ہو۔

(۱۰) اختتامیہ کو شامل کیا گیا ہو۔ (اس میں تحقیق کے نتائج بیان کیے جاتے ہیں)

سماجی نفسیات میں تحقیقی منصوبے کا خاکہ بایں صورت ہوگا۔

خاکہ

پہلا باب

(۱) بیان و غایت

(۲) مسئلہ کی اہمیت

(۳) مطالعہ کا مواد (سابقہ ریسرچ کا حوالہ)

(۴) مسلمات

(۵) مفروضوں کا بیان

(۶) کلیدی الفاظ کی تشریح

دوسرا باب

(۱) آبادی کی تشریح

(۲) آبادی کا نمونہ

(۳) حصولِ معطیات کا آلہ

(۴) اس کی تشکیل

(۵) پیش آزمائش

(۶) سوالنامے کی ہیئت

(۷) معطیات کے حصول کا طریقہ کار

تیسرا باب

(۱) ترتیب و تجزیہ

(۲) مفروضوں کی پرکھ

(۳) نتائج

چوتھا باب

(۱) تحقیق کا مختصر حاصل

(۲) معطیات کی روشنی میں سوال کا جواب

(۳) سفارشات (تکمیلی و تعمیلی)

(۴) مزید تحقیق

پانچواں باب

(۱) کتابیات

(۲) محرکات و منسلکات

(۳) اشاریہ

حصولِ مواد کے طریقے:

ماہرینِ تحقیق کے نزدیک کسی تحقیقی عمل میں مواد کا حصول درج ذیل طریقوں سے ممکن ہے۔

(۱) مشاہداتی طریقہ

(۲) باہم ملاقاتی (انٹرویو کا) طریقہ

(۳) مراسلاتی طریقہ

(۴) دستاویزاتی طریقہ

(۵) سوالیاتی طریقہ 11°

مشاہداتی طریقہ (The Observation Method)

یہ طریقہ، تحقیق میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ذریعے سے حاصل کردہ معطیات صحت و اعتماد میں دیگر طریقہ ہائے مواد سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔

باہم ملاقاتی طریقہ (The Interview Method)

یہ طریقہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ جب مشاہداتی طریقے سے معلومات کا حصول ناممکن یا پھر بہت مشکل ہو۔ ہمارے ملک میں اکثر سرکاری سطح پر کسی مسئلہ کی تحقیق میں یہی ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جیسے ملکی نظام تعلیم کے مسئلہ پر اربابِ تعلیم سے انٹرویو کے ذریعے حقائق دریافت کیے جائیں۔

مراسلاتی طریقہ (The Correspondence Method)

اس طریقہ میں خط و کتابت کو ذریعہ معلومات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض تحقیقی موضوعات میں اس کا استعمال نہایت ضروری ہوتا ہے۔

دستاویزاتی طریقہ (The Documentary Method)

یہ طریقہ مواد، متعلقہ دستاویزات، کتب و رسائل اور سرکاری و نجی ریکارڈ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ کیونکہ اس طریقہ میں انہی چیزوں سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دستاویزی طریقہ تحقیق میں کئی قسم کے ریکارڈز اور آثار (Remains) سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ وان ڈیلن (Van Dalen) کے حوالے سے وہ ریکارڈز اور آثار یہ ہیں۔

(۱) سرکاری ریکارڈز (۲) ذاتی ریکارڈز (۳) زبانی روایات (۴) تصویری ریکارڈز

(۵) مطبوعہ مواد (۶) میکانگی ریکارڈز (۷) آثار مثلاً (الف) مادی آثار (ب) مطبوعہ آثار

(ج) قلمی مواد (۸) متفرقات مثلاً فن کے مختلف نمونے اور یادگاریں 12°

تاریخی تحقیق کے سلسلہ میں بشا اور ہارٹ (Busha and Harter) نے جن ذرائع کو بیان کیا ہے۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) سالنامے (۲) آرکائیوز (۳) کیٹلاگ (۴) کرانیکل (۵) دستاویز (۶)

قصے کہانیاں

(۷) مخطوطے (۸) یادداشتیں (۹) یادگاریں (۱۰) اسنادِ حقوق مراعات (۱۱)

رجسٹر

(۱۲) رول (۱۳) جدول 13*

سوالیاتی طریقہ (The Questionnaire Method)

یہ طریقہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ جب مشاہداتی، دستاویزاتی اور باہم ملاقاتی طریقہ ہائے کار بے بس نظر آتے ہیں۔ اس طریقہ میں سوالنامہ ترتیب دے کر متعلقہ افراد کو بھیجا جاتا ہے۔ اور جوابات حاصل کیے جاتے ہیں۔

حواشی، حوالہ جات اور اقتباسات کا طریقہ استعمال

حواشی، حوالہ جات اور اقتباسات، جدید تحقیق کے وہ لوازمات تصور کیے جاتے ہیں کہ جن کے بغیر کوئی تحقیق، تحقیق نہیں سمجھی جاتی۔ چنانچہ پیشِ نظر مضمون میں انہی سہ گونہ عناوین کے تحت بعض امور درج ذیل ہیں۔

مسلمان مفسرین و محدثین نے قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح کو باحسن طریق سمجھانے کے لیے حواشی کا سہارا لیا۔ انہی حواشی میں انہوں نے اپنے خیالات کی وضاحت نہ صرف دیگر مفسرین و محدثین کے فرمودات و خیالات سے کی بلکہ ان کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق میں حواشی کا استعمال کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے۔

حواشی: (Content Footnotes)

حواشی کا واحد حاشیہ ہے۔ جس کے لغوی معنی کنارے اور ہم نشیں کے ہیں۔ اصطلاحی معنی میں یہ ان یادداشتوں کو کہا جاتا ہے جو کتاب کے حاشیہ پر لکھی جاتی ہیں۔ 14*

جدید تحقیق میں حواشی کو Content Footnotes کہا جاتا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ ان کا تعلق محض نشاندہی سے نہیں بلکہ مواد سے ہوتا ہے۔

ضرورت حواشی

(۱) حواشی (ذیلی اشارات) کو تحقیقی مقالہ کا جزو لازم سمجھا جاتا ہے .... عموماً متن میں مندرج مشکل الفاظ کی توضیح و تشریح کا کام حواشی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

(۲) اضافی مواد بہم پہنچانا مقصود ہو تب بھی حواشی کا سہارا لیا جاتا ہے۔

(۳) مقالہ میں دیگر مصنفین کے رشحاتِ قلم کا تذکرہ بھی حواشی میں کیا جاتا ہے۔ چونکہ حواشی کی شمولیت مقالہ کو وقیع بناتی ہے۔ استدلال میں معاونت کرتی ہے۔ اس لیے اگر ان کا استعمال برمحل نہ ہو تو اس تکنیکی خامی سے معیارِ تحقیق مشکوک ہو کر ایک اور پایہ استناد و صحت سے گرا ہوا مانا جا سکتا ہے۔

استعمال حواشی

استعمال حواشی کے لئے دنیائے تحقیق میں عام طور پر تین طریقے رائج ہیں۔

اولاً یہ کہ ہر صفحے کے حواشی، اس صفحہ پر درج کر دیے جائیں۔ یہ حواشی کی صفحہ وار تقسیم ہے۔

ثانیاً یہ کہ ہر باب کے حواشی اختتام باب پر دے دیے جائیں۔ یہ حواشی کی باب وار تقسیم ہے۔

ثالثاً یہ کہ پورے مقالہ کے حواشی ایک ہی بار (باب اور صفحہ نمبر کے ساتھ) مقالہ کے آخر میں جمع کر دیے جائیں۔

راقم کے نزدیک ان میں پہلا طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں قاری کو بار بار صفحے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ متن میں دیے گئے اشارے کی تفصیل وہ اسی صفحے پر دیکھ لیتا ہے اور یوں مطالعہ کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔

تحقیق کا مسلّمہ اصول یہ بھی ہے کہ حصولِ مواد کے ذرائع کا تذکرہ کیا جائے خواہ وہ مواد جوں کا توں لیا گیا ہو یا اس کا خلاصہ کشید کیا گیا ہو، بہرحال اس کا تذکرہ ذیلی اشارات یا حواشی کی شکل میں کیا جانا ضروری ہے۔

حوالہ جات: (References or Quotations)

لغت میں حوالہ کا ایک معنی پتہ اور نشان بھی ہے۔ 15* چونکہ یہ مقالہ کے متن میں شامل افکار و خیالات کے ماخذ کا پتہ بتاتے ہیں۔ اس لئے اسے حوالہ کہتے ہیں۔

حوالہ جات کی اہمیت

تحقیقی مقالہ میں حوالوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کیوں کہ انہی سے دلیلوں کو سند ملتی ہے۔ نیز اس کے ذریعہ ہی قاری کو محقق کے ماخذ و مصادر کا علم ہوتا ہے۔ اس لئے ہر محقق اپنے مقالہ میں حوالہ جاتی کتب کی فہرست ضرور دیتا ہے۔

حوالہ جاتی کتب کی فہرست عموماً دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اولاً کتب ثانیاً رسائل تاہم بوقت ضرورت ''قلمی نسخے'' کے زیر عنوان تیسرا حصہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ نیز ان حصوں کو لسانی اعتبار سے مزید ذیلی حصوں میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

استعمال حوالہ جات

جدید تحقیق میں حوالہ جات کے ضمن میں عموماً دو طریقہ رائج ہیں۔ جن میں سے ایک ہارورڈ یونیورسٹی سے منسوب ہے، جبکہ دوسرا شکاگو یونیورسٹی سے۔ ''ہارورڈ میں اپنائے گئے طریقہ کے مطابق حوالہ کا وقوع دو حصوں میں دو جگہوں پر ہوتا ہے۔ ایک حصہ متن میں ہی بریکٹ کے اندر دے دیا جاتا ہے۔ اس میں مصنف کا خاندانی نام یا نام کا آخری حصہ لکھ کر تصنیف کا سال اشاعت اور صفحہ نمبر دے دیا جاتا ہے۔ 16*

حوالہ کا دوسرا حصہ عموماً مقالہ یا کتاب کے بالکل آخر میں دیا جاتا ہے۔ وہاں مصنف کا پورا نام درج کیا جاتا ہے۔ اور اسمائے مصنفین میں حروف ابجد کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس طریقہ میں مختصر حوالہ متن کے اندر بریکٹ میں اور تفصیل حوالہ کتاب کے آخر میں دیا جاتا ہے۔

شکاگو میں اپنائے گئے طریقہ کے مطابق متن کے نیچے ہر صفحہ پر متعلقہ حوالہ دے دیے جاتے ہیں۔ یہ حوالہ جات صفحہ وار بھی ہو سکتے ہیں اور باب وار بھی۔ تاہم صفحہ وار حوالے احقر کے نزدیک انسب ہیں۔ جیسا کہ اس کا سبب حواشی کے تحت مذکور ہوا۔

راقم کے نزدیک حوالہ جات کے ضمن میں یہ امر پیش نظر رکھنا یقیناً بہتر ہوگا کہ مقالہ میں جب پہلی بار کسی کتاب کا حوالہ دیا جائے تو وہ تفصیلی کوائف پر مشتمل ہو۔ جس میں کتاب کا نام، صفحہ نمبر، مصنف/مؤلف/مرتب/مترجم/ کا مکمل نام، ناشر کا نام و پتہ اور سال تصنیف وغیرہ درج ہو۔ البتہ دوسری بار یا اس سے بھی زائد بار حوالوں میں محولہ کتاب کا حوالہ محض نام کتاب اور صفحہ نمبر کے ساتھ دیا جاسکتا ہے۔

اس طریقہ حوالہ کا ایک مفاد یہ ہے کہ درمیان کتاب یا کہیں بھی اگر کسی صفحہ پر تفصیلی حوالہ موجود ہوگا تو قاری بآسانی سمجھ لے گا کہ یہاں محولہ کتاب کا حوالہ پہلی مرتبہ Quote کیا گیا ہے۔ پھر ان سارے حوالوں کو مع تفصیلی کوائف کے اختتام کتاب پر اکٹھا کر کے الگ درج کر دیا جائے جیسا کہ عام طور پر رواج بھی ہے۔

مقاصد حوالہ جات

حوالہ جات کے بڑے بڑے مقاصد یہ ہیں۔

(۱) جب محقق کسی کتاب سے کوئی عبارت یا فقرہ نقل کرتا ہے۔ تو اس کے ماخذ کا (مع تفصیلی کوائف کے) حوالہ دیتا ہے۔

(۲) جب محقق کسی مصنف کا کوئی نظریہ یا دلیل Quote کرتا ہے تو اس کی نشاندہی کے لئے حوالہ درج کرتا ہے۔

(۳) جب محقق اعداد و شمار کے ساتھ کوئی حقیقت بیان کرتا ہے تو اسے بھی اپنے ماخذ سے ساتھ بیان کرتا ہے اور یہی ماخذ اس کا حوالہ ہوتا ہے۔

ماخذ مختلف الاقسام ہوتے ہیں تاہم سعید الدین احمد ڈار 17* نے اپنے مقالہ 18* میں ان کی جو فہرست درج کی ہے وہ یہ ہے۔

(۱) الہامی اور غیر الہامی دینی کتب

(۲) عام کتب

(۳) مختلف مصنفین کے مضامین پر مشتمل کتب

(۴) مجلات میں مضامین

(۵) اخبارات

(۶) انسائیکلوپیڈیا

(۷) لغات

(۸) مخطوطات

(۹) کاروائی ہائے اجلاس و کانفرنس

(۱۰) قانونی کتب بشمول عدالتی فیصلے، قوانین، مسودات قوانین، اسمبلیوں کے مباحث، حکومتی رپورٹیں وغیرہ۔

(۱۱) محقق کی ذاتی خط و کتابت وغیرہ

بعض محقق حوالہ جات کے ضمن میں کثرت حوالہ پر اس قدر زور دیتے نظر آتے ہیں کہ بقول سعید الدین ڈار 19* کے وہ حوالہ نہیں دیتے بلکہ حوالہ سازی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''حوالہ سازی'' سے مراد یہ ہے کہ وہ حقائق جو عام فہم یا اکثر واشہر ہوں اور عموماً ان سے تعرض کا رویہ عوام الناس میں بھی نہ پایا جاتا ہو۔ تو ایسی چیزوں کے لئے حوالہ کو لازم کر لینا یقیناً حوالہ سازی ہوگا۔

اقتباسات (Extractes)

اقتباس کے لغوی معنی چھانٹنے اور چننے کے آتے ہیں۔ جب کہ اصطلاحاً یہ چنے ہوئے کلام یا مختصر تحریر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔[20]

مقاصد اقتباسات

(۱) عام طور پر اقتباسات اس وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔ جب کسی مصنف کا اقتباس اس کی عبارتوں اور تصورات کی پیشکش سے بہتر طور پر محقق کے مفروضوں اور دلیلوں کو ثابت کر سکتا ہو۔[21]

(۲) جب کوئی اقتباس اتنا خوبصورت ہو کہ اس سے مقالہ کا صوری حسن بڑھ جانے کی توقع ہو۔[22]

(۳) یا محقق کو دستاویزی شہادت میں مطلوب ہو۔

(۴) یا اعداد و شمار کے اختلاف کو ظاہر کرنا مقصود ہو۔

(۵) یا کہیں تناقض پایا جاتا ہو جسے نمایاں کرنے کیلئے نقل اقتباس ضروری ہو گیا ہو۔

(۶) یا محقق کو کسی مصنف کے نظریہ سے اختلاف ہو۔

استعمال اقتباسات

یہ امر پیش نگاہ رہے کہ اقتباسات بلا ضرورت اور بلا جواز نہ پیش کئے جائیں۔

☆ اگر کسی غیر مطبوعہ مسودہ سے اقتباس لیا جائے تو محرر سے اس کی اجازت ضرور حاصل کر لے (اگر محرر بقید حیات ہو)

☆ اقتباس کو نہایت حزم و احتیاط اور صد درجہ صحت و استناد کے ساتھ پیش کیا جائے حتیٰ کہ معمولی لفظی تغیر بھی نہ ہونے پائے۔

☆ اقتباس کو مصنف کی اپنی زبان میں نقل کیا جائے۔ دوسری زبان ہونے کی صورت میں ذیل میں اس کا ترجمہ درج کیا جا سکتا ہے۔

بہت زیادہ اور غیر ضروری اقتباسات سے احتراز لازم ہے۔ کیونکہ ایسا عمل اچھے مقالہ کی وقعت و ثقاہت کو مجروح کرتا ہے۔ اقتباس کا کوئی حصہ حذف کرنا مقصود ہو تو وہاں تین نقطے اس طرح ••• ڈال دیے جاتے ہیں۔ یہ نقطے محذوف عبارت کی پہچان ہوتے ہیں۔

مقالہ میں کسی کتاب سے طویل اقتباسات درج کرنا اچھے مقالہ کی پہچان نہیں۔ الا یہ کہ سائنسی اور سماجی علوم کی ضروریات کے تحت ایسا کیا جائے۔ بشرطیکہ ان میں اصول، فارمولے اور نتائج اپنی اصلی شکل میں ہوں۔ اقتباس میں صاحب اقتباس کے الفاظ من و عن درج کئے جاتے ہیں۔ اگر

اقتباس چار سطری تک ہو تو اسے متن کے ساتھ ہی لکھ دیا جاتا ہے۔ البتہ اسے نمایاں کرنے کے لئے شروع اور آخر میں الٹے کومے ڈال دیے جاتے ہیں۔ تاہم اگر اقتباس بہت زیادہ اہم ہو تو باوجود یک، دو، سہ، یا چار سطری ہونے کے اسے علیحدہ کر کے بھی لکھا جا سکتا ہے۔

اگر اقتباس کا مواد چار سطری سے زائد ہو تو اسے اکثر متن سے الگ کر کے لکھا جاتا ہے۔ عام طور پر اقتباس کو باریک خط میں لکھنے کا رواج ہے۔ جب اقتباس متن سے علیحدہ کر کے تحریر کیا جائے تو وہاں الٹے کومے دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حواشی و حوالہ جات

۱) مطبوعہ قمر کتاب گھر، اردو بازار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۸ء

۲) اردو میں اصول تحقیق (جلد اول) ص ۱۹۳ مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول جون ۱۹۸۶ء

۳) مترجم محمد علیم انصاری، ناشر میر محمد کتب خانہ مرکز علم و ادب آرام باغ کراچی

۴) اصول تحقیق کورس نمبر ۱۱۷، برائے ایم فل اسلامیات، اسلام آباد میں تحقیق کے اصول و مبادی کورس نمبر ۱۲۲، ایم فل اسلامیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

۵) اردو میں اصول تحقیق، جلد 1 ص 165-167

۶) اردو میں اصول تحقیق، جلد 1 ص 168-170

۷) وان ڈیلن (Van Dalan) نے نقد خارجی کیلئے تحقیق میں مطلوب جن امکانی سوالات کو بیان کیا ہے وہ تعداد میں 16 ہیں، جنہیں سید جمیل احمد رضوی نے اپنے مقالہ زیر عنوان "دستاویزی طریق تحقیق" میں شامل کیا ہے۔ (بحوالہ اردو میں اصول تحقیق، جلد 1 ص 173-178)

۸) اردو میں اصول تحقیق، جلد 1 ص 179-180

نوٹ: وان ڈیلن (Van Dalan) نے نقد خارجی کی طرح داخلی کیلئے دستاویزی تحقیق میں مطلوب جن سوالات کو اٹھایا ہے وہ تعداد میں 14 ہیں، جنہیں سید جمیل احمد رضوی نے اپنے مقالہ "دستاویزی طریق تحقیق" میں انہیں بھی شامل کیا ہے۔ (بحوالہ اردو میں اصول تحقیق، جلد 1 ص 183-184)

۹) مقالہ "موضوع کا انتخاب" بحوالہ اردو میں اصول تحقیق، جلد 1 ص 139، ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۱۰) مقالہ "موضوع کا انتخاب" بحوالہ اردو میں اصول تحقیق، جلد 1 ص 141

۱۱) نفسیاتی شماریات و تحقیقاتی طریقے، سید ساجد حسین، ص 349-340، بار ششم، کفایت اکیڈمی، کراچی 1987

۱۲) مقالہ دستاویزی طریق تحقیق، سید جمیل احمد رضوی، بحوالہ اردو میں اصول تحقیق، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، جلد 1، ص 167-165

۱۳) ایضاً، ص 168 تا 170

۱۴) فیروز اللغات اردو جدید، بار ششم 1976، فیروز سنز لاہور

۱۵) فیروز اللغات اردو جدید، بار ششم 1976، فیروز سنز لاہور

۱۶) اصول تحقیق، برائے ایم فل اسلامیات کوڈ نمبر 711، ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۱۷) پروفیسر

۱۸) بعنوان "تحقیق میں حواشی، حوالہ جات اور اقتباسات" شامل کتاب "تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات" ادارہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جون 1986

۱۹) ایضاً، ص 144

۲۰) فیروز اللغات اردو جدید، بار ششم 1976، فیروز سنز لاہور

۲۱) اصول تحقیق، کوڈ نمبر 711، ص 116

۲۲) اردو میں اصول تحقیق، جلد 1، ص 260

وفیات

تمہاری نیکیاں زندہ، تمہاری خوبیاں باقی

مولانا حافظ محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

کراچی کے ممتاز عالم دین، بلند پایہ خطیب، بالخصوص قرآنی مضامین کے ماہر مولانا حافظ محمود الحسن اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

۲۰ اگست ۲۰۰۷ء بروز پیر آپ کا انتقال ہوا اور اگلے روز جامع مسجد رحمانیہ طارق روڈ کراچی سے متصل قبرستان میں تدفین ہوئی۔ بروز منگل ایک بجے حافظ کامران قریشی کے ذریعے مرحوم کے انتقال کی خبر ملی اور ساتھ ہی پتہ چلا کہ اب سے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد یعنی بعد نماز ظہر، جامع مسجد رحمانیہ میں نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ اطلاع ملتے ہی میں حافظ کامران کے ہمراہ مولانا شاہ حسین گردیزی کے پاس پہنچا۔ وہ پہلے سے ہمارے منتظر تھے اور دارالعلوم کے باہر ہی کھڑے تھے۔ یوں ہم تینوں افراد اکٹھے جنازہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ کراچی کی سڑکوں کا ان دنوں جو حال ہے اور ٹریفک رش کے باعث ٹرانسپورٹ کی جو چال ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ پھر ایسے میں ہماری گاڑی کیسے بروقت پہنچ سکتی تھی؟ چنانچہ جنازہ کی نماز تو نہ مل سکی، تاہم جنازہ کے بعد کی خصوصی دعا اور تدفین میں شریک ہو سکے۔ اس موقع پر مفتی محمد رفیق الحسنی، مفتی محمد جان نعیمی، پروفیسر ڈاکٹر مولانا غلام عباس قادری اور ڈاکٹر مولانا نور احمد شاہتاز کے علاوہ متعدد علماء اور مرحوم کے تلامذہ کے ساتھ عقیدت مندوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔

مرحوم اولاد نرینہ سے محروم تھے تاہم شاگردوں کی ایک معتدبہ تعداد یعنی معنوی اولاد سے مالا مال تھے اور زندگی کے آخری ایام جن میں شدید بیمار ہوئے اور جس کے تسلسل میں وہ بالآخر اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان آخری لمحوں میں وہی ان کے آس پاس تھے بالکل اولاد کی طرح، یہ وہ حقیقت ہے جو مجھے انتقال کے اگلے روز مرحوم کی اہلیہ نے خود فون پر بتائی۔

مرحوم کو میں طویل عرصے سے جانتا تھا۔ مولانا شاہ حسین گردیزی سے پہلی مرتبہ ان کا نام سنا اور کیا عجیب اتفاق ہے کہ ان کی آخری رسومات کے موقع پر میں گردیزی صاحب سے ہی ان کا ذکر دوبارہ سن رہا تھا۔ حافظ صاحب کو پہلی بار کسی ٹی وی چینل پر انجانی حیثیت سے سننے اور دیکھنے کا موقع ملا۔ جب

تک اسکرین پر ان کا نام نہیں آیا۔ میں سوچتا رہا کہ اتنے خوبصورت لب ولہجے میں خالص اردو بولنے والے، وجیہ صورت بزرگ عالم دین کون ہو سکتے ہیں کہ جنہیں سننا بھی اچھا لگ رہا تھا اور دیکھنا بھی۔ مگر میرا یہ استعجاب بہت جلد ختم ہو گیا کیونکہ حافظ صاحب کا نام اسکرین پر آ چکا تھا۔ یہ رمضان المبارک کے ایام تھے اور مرحوم کو ہر روز ایک سیپارہ پر کلام کرنا ہوتا تھا۔ میں کوشش کرتا کہ ہر روز ان کی گفتگو سنوں اور لذت قرآنی سے سرشار رہوں۔ قرآن ویسے بھی میرا پسندیدہ سبجیکٹ ہے۔ قرآنی حوالے سے جب بھی کوئی بات کرتا ہے تو دراصل وہ میری دلچسپی کا سامان کرتا ہے۔ قرآن سے اک گونہ بلکہ خصوصی تعلق کے باعث مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ بولنے والا قرآن جانتا بھی ہے یا بس یونہی بطور فیشن کے محو کلام ہے۔

پھر ایک دن مولانا محمد اعظم سعیدی کا فون آیا کہ حافظ صاحب کو میں نے آپ کا فون نمبر دے دیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ پریشان مت ہونا وہ بات لمبی کرتے ہیں مگر کمال کی کرتے ہیں خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات پر قرآن سے استدلال کرتے ہیں اور عام سی باتوں کو بھی ہمہ رنگ قرآن کر دیتے ہیں۔ پھر انہوں نے ازراہ تفنن یہ بھی کہا کہ آپ بھی چونکہ قرآن قرآن کرتے رہتے ہیں اور وہ بھی یہی کرتے ہیں۔ سو میں نے سوچا کہ اب میں درمیان سے ہٹ جاؤں اور آپ دونوں کو آپس میں ٹکراؤں۔ پھر ایک دن فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو پتہ چلا کہ حافظ صاحب آن لائن ہیں اور اپنے مخصوص لب ولہجے سے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ یہ ان سے میرا پہلا مکالمہ تھا جو فون پر ہوا، اس کے بعد سلسلہ چل پڑا۔ البتہ حافظ صاحب سے بالمشافہ ملاقات کا شرف اس دن حاصل ہوا۔ جب قائد ملت اسلامیہ مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کا چہلم تھا۔ تفصیلی اجمال یہ ہے کہ پروگرام کے مطابق میں پہلے مولانا اعظم سعیدی کے گھر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ مولانا عبدالکریم سیالوی کو ساتھ لینا ہے۔ جو راستے میں ہمارے منتظر ہیں اور مرحوم مولانا حافظ محمود الحسن کو بھی ان کے گھر سے لینا ہے۔ یوں مرحوم سے بالمشافہ پہلی ملاقات کی تقریب پیدا ہوئی اور ان کے گھر سے (واقع پی ای سی ایچ ایس) سے کلفٹن تک کا سفر ایک یادگار علمی سفر رہا، جو آج تک میرے حافظے میں ہے اور کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ان کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی باتوں کی مہک آج بھی تازہ ہے۔ اور ان کا پرنور چہرہ جسے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ خیالوں میں رہتا ہے۔ تازہ گلاب کی مانند کھلا ہوا حسین چہرہ، جو تقویٰ وطہارت اور کریم النفسی کی شبنم سے دھلا ہوا تھا سرخی وسپیدی سے ممزوج یعنی گلابی رنگت، پھر اس پر طرزِ آواز کا جادو بھرا آہنگ، مخصوص طرز ادا پھر اس پر مستزاد خالص قرآنی مضامین سے مالا مال گفتگو، جس کے استشہاد میں قرآن بار بار سننے کو ملے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سج دھج کا انسان زندگی میں کم ہی دیکھنے کو ملا ہے۔

مرحوم کو میں مجلہ التفسیر بھیجا کرتا تھا۔ وہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ بالخصوص میرے مضامین، خصوصی توجہ سے دیکھا کرتے تھے۔ صرف مجلہ کے تعلق سے ہر سہ ماہی کو ان کے دو فون اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک فون مجلے کی رسید ہوتا اور دوسرا مجلہ پر تبصرہ۔ وہ میری تحقیقات کو بے حد سراہتے اور اس کا برملا اظہار کرتے۔ مجھے مولانا سعیدی سے بھی پتہ چلتا رہتا تھا کہ قرآن کے حوالے سے وہ مجھے بہت پسند کرتے اور اپنی دعائے خصوصی میں یاد رکھتے ہیں۔ اور مستقبل میں مجھ جیسے کم علم اور کوتاہ فہم سے بہت سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔

میں مرحوم سے جب بھی کہتا کہ آپ ہمارے مجلے کیلئے کچھ لکھئے تو فرماتے۔ میں لکھنے کا بہت چور ہوں۔ کاش مجھے بھی آپ کی طرح لکھنا آتا تو ضرور لکھتا۔ پھر فرماتے، مضمون تو نہیں البتہ التفسیر کے تعلق سے آپ کو ایک خط ضرور لکھوں گا اور پھر حسب وعدہ ایک دن ان کا وہ مکتوب موصول بھی موصول ہو گیا۔ لفافے میں خط کے اندر تین سو روپے بھی لپٹے ہوئے تھے۔ اور خط میں ایک طرف بطور نوٹ کے لکھا تھا "ایک جرأت بلکہ جسارت کر رہا ہوں اور امید ہے کہ آپ پر بار خاطر نہ ہوگا اور محسوس نہیں فرمائیں گے"۔ میں نے اسی وقت حافظ صاحب کو فون کیا۔ پہلے تو ان کے گرامی نامے پر شکریہ پیش کیا۔ پھر تین سو روپے بھیجنے کا شکوہ کیا۔ میں نے کہا حضرت! پتہ نہیں، میں کس کس کو اپنا مجلہ اعزازی بھیجتا ہوں۔ پھر آپ تو ہمارے بزرگوں میں ہیں۔ ہمارے لئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ آپ ہمارا مجلہ پڑھتے اور اس پر تبصرہ فرماتے ہیں پھر آپ نے یہ کیا کر دیا؟ مجھے کیوں شرمندہ کر دیا؟ مگر مرحوم سے گفتگو میں بڑھ جانا بڑے بڑوں کے لئے مشکل ہوتا تھا۔ پھر میں کیسے بڑھ سکتا تھا۔ بالآخر وہ جیت گئے اور میں نے وہ نوٹ تبرک سمجھ کے رکھ لئے۔

اکثر عید اور بقر عید کے موقع پر میں اور مولانا اعظم سعیدی ان سے ملنے ان کے گھر جاتے۔ اور ان کا ہشاش بشاش چہرہ اور ان کی کشادہ باہوں کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ بہت خوش خلق ملنسار اور مہمان نواز عالم تھے۔ ایسے علماء اب خال خال نظر آتے ہیں۔

میری خواہش تھی کہ وہ ایک دن میرے گھر ضرور تشریف لائیں، اور وہ خود بھی یہی چاہتے تھے مگر افسوس کہ خواہش باہم کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکے۔ البتہ گاہے گاہے گھر آنے کی بات ضرور کرتے رہتے تھے اور ساتھ ہی نہ آ سکنے کا عذر معقول بھی سنا دیا کرتے تھے یعنی کچھ تو ضعف پیری اور کچھ بیماری۔ غرض دونوں پر ہی الزام دھر دیا کرتے تھے۔ پھر مرزا غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ یہ شعر پڑھتے۔

ضعف نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میرا اندازہ ہے کہ وہ ستر سال سے کچھ اوپر تھے، مگر جیسے بشرے، چہرے مہرے اور آواز و لہجے سے بالکل تر و تازہ اور شاداب نظر آتے تھے۔ قرآن مجید کے اتنے پکے حافظ تھے کہ اپنے بچپن سے انتقال تک شاید ہی کوئی مصلیٰ چھوڑا ہو۔ شعبان المعظم میں ان کا انتقال ہوا۔ یوں پچھلا رمضان ان کی زندگی کا آخری رمضان ثابت ہوا۔ رحمانیہ مسجد (طارق روڈ) میں کئی سال امام و خطیب رہے اور دلوں پر حکمرانی کرتے رہے۔ وہ درویش صفت، منکسر المزاج اور سادہ طبیعت انسان تھے، وہ زندگی میں بڑے بڑوں سے متاثر نہ ہوئے اور نہ کسی کو خاطر میں لائے۔ بڑے بڑے سرمایہ داران کے حلقہ ارادت میں آئے مگر وہ خود کسی کے رعب میں نہ آئے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی کسی سے کوئی طمع نہ رکھی، البتہ دوسروں کیلئے کچھ کہنے میں کبھی عار بھی محسوس نہ کی۔ ان کی سفارش پر بہت سوں کے کام ہوئے جن کی الگ تفصیل ہے۔

مرحوم قرآن کریم کے بہت بڑے عالم تھے۔ مگر خود کو طالب قرآن کہتے تھے۔ اپنا تعارف بھی وہ اسی انداز سے کراتے تھے۔ قرآن کے آگے ہمیشہ سرنگوں رہے۔ بعض مسائل پر میرا ان سے اختلاف بھی ہوا۔ میرا قرآنی استدلال جب بھی ان کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہوا، بغیر کسی تامل کے وہ میرے ہمنوا ہو گئے۔ قرآن کے آگے سر جھکانے کی یہ اسپرٹ اب کہاں دیکھنے کو ملتی ہے؟ حافظ صاحب مرحوم دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اور پس ماندگان میں اپنی محبوب اہلیہ اور اکلوتی بیٹی آنسہ ہاجرہ کے علاوہ مجھ سمیت سینکڑوں عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔

تمہاری نیکیاں زندہ، تمہاری خوبیاں باقی

ذیل میں راقم الحروف کے نام حافظ محمود الحسن کا مکتوب گرامی پیش کیا جا رہا ہے۔

پیکرِ علم و دانش۔ سراپا فکر و تحقیق۔ محبی و محسنی۔ مکرمی و محترمی

جناب ڈاکٹر حافظ محمد شکیل صاحب اوج مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی

امید واثق کہ آپ مع فرزندان سعید اور اہل خانہ کے بخیر و عافیت ہوں گے۔ آمین

گذشتہ باسی بلکہ پرانی عید سعید مبارک ہو۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ عجیب و غریب آدمی

ہے کہ اتنی پرانی عید کی مبارک باد ارسال کر رہا ہے۔

تو صاحب! بات یہ ہے کہ ۲۰ ماہ رمضان المبارک کے بعد سے ہم مع اہل خانہ راقم الوقت بیماری سے صاحب فراش رہے۔ اتنا ہوا ہے کہ علاج معالجہ سے اب جا کر کچھ فرق پڑا ہے۔ اللہ رب العالمین سے دست بدعا ہوں کہ وہ ذات باری آپ سب کو اور ہمیں ہر قسم کی بیماریوں سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

مزید عرض ہے کہ مجلہ التفسیر کا چوتھا شمارہ مجھے ابھی تک موصول نہیں ہوا۔

ایک جرأت بلکہ جسارت کر رہا ہوں اور امید ہے کہ آپ پر بار خاطر نہ ہوگا اور محسوس بھی نہیں فرمائیں گے۔ وہ یہ کہ مبلغ 300.00 تین سو روپیہ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ یہ رقم مجلہ التفسیر کیلئے زر تعاون ہے۔ مبلغ ایک سو روپیہ زر تعاون 2005ء کا ہے۔ سال گذشتہ کا۔ دوسرا سو روپیہ زر تعاون برائے سال 2006ء کیلئے ہے۔ تیسرا سو روپیہ سال آئندہ 2007ء کیلئے ہے۔ وصول فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں۔

کیونکہ یہ معاملات دنیا ہیں۔ قصہ زمین برسر زمین۔ آج کوئی بھی چیز یوں ہی ہاتھ نہیں آتی۔ اس پرفتن اور پر آشوب بلکہ قیامت خیز دور میں ایک علمی مجلہ کا چلانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت و توفیق اور استطاعت عطا فرمائے اور آپ کی ذات سے تشنگان علم کو فرحت و انبساط عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین (ﷺ)

میری طرف سے میرے محترم صاحب علم و فضل۔ سراپا علم و تحقیق حضرت علامہ محمد اعظم صاحب سعیدی کو سلام پیش کر دیجئے گا۔ فرزندان ارجمند کیلئے بہت ساری دعائیں۔ بھابھی صاحبہ کو عید مبارک اور سلام قبول ہو۔ مزید کارلائقہ سے یاد فرما دیں۔ شکریہ۔ اللہ حافظ و ناصر ہو۔

فقط والسلام، نیاز مند
حافظ محمود الحسن
8 نومبر 2006

پتہ: فلیٹ ۳، ۲ دوسری منزل، 109-K/2
پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی 75400

غواص القرآن حافظ محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ

محمد اعظم سعیدی

كل شئ يرجع الى اصله . عالم بقاء سے عالم فنا میں آئے اور پھر عالم بقا کو لوٹ گئے، آہ ترجمان القرآن حضرت حافظ محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیں عالم دنیا میں تنہا کر گئے۔ ان کے انتقال سے قرآن فہمی کا ایک باب بند ہو گیا، قرآن کی روشنی سے قلب و دماغ کو مستنیر کرنے والا ایک درخشاں ستارہ غروب ہو گیا، قرآن کا درک رکھنے والی کہکشاں کا ایک اور ستارہ ڈوب گیا، خدا اس پاک طینت و پاک سرشت پر اپنی رحمتوں کا سایہ فرمائے (آمین)

حافظ صاحب مرحوم کا علم بڑا منہ زور تھا اور کثرت مطالعہ سے شہ زور بھی۔ اگرچہ کتب احادیث و فقہ پر انہیں عبور تھا۔ مگر قرآن کو صرف قرآن سے ہی سمجھنا انہیں منظور تھا۔ قرآن سے قلبی لگاؤ اور گہری محبت کا یہ عالم تھا کہ کم و بیش ۶۰ سال (گذشتہ رمضان) تک تراویح میں قرآن سنایا۔ یعنی پیرانہ سالی اور مختلف امراض کی حملہ آوری انہیں قرآن مجید پڑھنے، رکھنے، سمجھانے اور سنانے سے باز نہ رکھ سکی۔ حتی کہ ایام مرض میں بھی تلامذہ کو تفسیر پڑھاتے رہے۔ ان کی درس گاہ ان کے فلیٹ کا ایک کمرہ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ واحد درسگاہ تھی جو چندے اور فیس سے مبرا تھی۔ دوسرا کمرہ نادر و نایاب کتب سے معمور مطالعہ گاہ تھا۔ جبکہ ایک کمرہ ہونہار صاحبزادی اور سلیقہ شعار بیوی کیلئے وقف تھا۔ یہ ہے کل کائنات اس عالم قرآن کی جو ہزاروں دلوں میں بستا ہے۔ اگرچہ غائبانہ طور پر ہم ایک دوسرے کے بہت پہلے سے شناسا تھے۔ مگر ان سے بالمشافہ پہلی ملاقات ۱۹۸۶ء میں پیر مہر علی شاہ گولڑوی پر منعقدہ ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔ یہ ملاقات اگرچہ دو مختلف نظریات کے ٹکراؤ کے باعث یادگار رہ بن گئی۔ مگر دوران بحث حافظ صاحب مرحوم کے بکثرت قرآنی آیات کو بطور دلیل تلاوت کرنے پر ان کی قرآن سے گہری رغبت کا رعب میرے دل میں ضرور سما گیا۔ پھر گاہے گاہے مختلف محافل و سیمینارز میں ملاقاتوں کے تسلسل سے ان کی علمی وسعتیں مجھ پر آشکار ہوتی رہیں۔ اور یوں ذہنی و قلبی قربتیں بھی بڑھتی رہیں۔ غرض کہ ان کی طرف سے بے پناہ محبت کے اظہار اور میری جانب سے عقیدت کے اقرار نے ہمیں یک جان دو قالب کر دیا (من تو شدم تو من شدی)

حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رواداری کا ایک واقعہ اس طرح ہے کہ مصر کے مفتی امام خرپوتی

نے بارہویں صدی ہجری میں قصیدہ بردہ کی علم منطق، کلام، معانی، بدیع، جغرافیہ اور تاریخ کے حوالے سے بڑی مبسوط و ضخیم شرح عصیدۃ الشہدہ کے نام سے لکھی تھی۔ اس پر چار دیگر علماء کے حواشی بھی تھے۔ حضرت حافظ صاحب اس کا قلمی نسخہ مصر سے لائے تھے اور اس کا اردو میں ترجمہ کرانے کی تمنا رکھتے تھے۔ چونکہ پیرانہ سالی کے باعث خود لکھنے سے عاجز تھے، اس لئے مختلف علماء سے معقول معاوضہ پر ترجمہ کر دینے کی استدعا کی مگر کئی سال تک مختلف ہاتھوں سے ہو کر وہ کتاب من و عن ان کے پاس آ گئی۔ ۸ نومبر ۲۰۰۰ء کو رمضان کے مہینے میں مولانا انور احمد شہباز عصیدۃ الشہدہ شرح قصیدہ بردہ لیکر میرے پاس آئے اور کہا کہ اسکے پہلے دو صفحات کا ترجمہ کر دیں۔ کل آکر لے جاؤں گا۔ دوسرے دن میں ترجمہ کر کے انہیں دے دیا۔ پھر ایک ہفتہ بعد شہباز صاحب نے ہی آکر بتایا کہ اس کتاب کا ترجمہ کریں اور یہ کتاب حافظ محمود الحسن صاحب کی ہے۔ یہ بھی بتا دیں کہ محنتانہ کیا لیں گے۔ یہ سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ حافظ صاحب نے مجھ سے خود کیوں نہیں فرمایا، اس واسطہ کی کیا ضرورت تھی؟ پھر سوچا کہ جو شخص لحاظ داری، رواداری، ملنساری، وفاداری، عاجزی و انکساری جیسی صفات کا مجسم پیکر ہو، وہ اپنے عقیدت مند سے محنتانے کی بات کیسے کر سکتا ہے۔ بہر حال میں نے اس ضخیم شرح کا ترجمہ کر دیا۔ پھر وہ ترجمہ تین سال پہلے محمد ریاض گوہر والا بغرض اشاعت لے گئے تھے۔ جسے تا حال وہ نہیں چھاپ سکے، اب ان شاء اللہ حافظ صاحب مرحوم کی پہلی برسی پر وہ ترجمہ شائع کر دیا جائیگا۔ عصیدۃ الشہدہ وہ شرح ہے جس نے ہماری ملاقاتوں میں اضافہ کر دیا۔ حافظ صاحب علیہ الرحمۃ کے روزانہ کے معمولات میں یہ تھا کہ آپ بعد نماز ظہر قیلولہ فرماتے۔ پھر علماء اور آئمہ و خطباء کو تفسیر قرآن پڑھاتے۔ عصر سے مغرب تک اپنے والد مرحوم کی قبر پر بلاناغہ قرآن کی تلاوت کرتے۔ میں ہر دوسرے، تیسرے دن حاضر ہوتا تو زیر درس آیت کے حوالے سے مجھ سے مخاطب ہو جاتے اور اس کی توضیح و تشریح میں دیگر آیات سے استدلال فرماتے۔ مفسرین و مؤرخین کی تحریر کردہ اسرائیلی روایات کو در خور اعتناء نہ سمجھتے تھے۔ وہ اس یقین کے مالک تھے کہ قرآن خود ہی متن ہے اور خود ہی مفسر ہے۔ دو سال پہلے مغفرت ذنب کے مسئلہ پر حافظ صاحب نے ذنب، اثم، حوب، خطاء، جناح اور معصیت جیسے لفظوں کی ادب و لغت، صرف و نحو، معانی و لسانیات اور اقوال مفسرین و فقہاء سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف قرآن سے مدد لے کر خوب تحقیق فرمائی تھی اور وہ تحقیق تین آڈیو کیسٹ میں ریکارڈ ہے جو ان کے ایک شاگرد عزیز کے پاس محفوظ ہے۔

ایک دفعہ آئمہ و خطباء کی کلاس کو سورہ بقرہ کی آیات ۳۳ تا ۳۶ کا درس دے رہے تھے۔ اتنے وقت مسودہ لے کر میں بھی حاضر ہو گیا۔ حسب روایت مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا، کیا ابلیس فرشتوں میں

سے تھا؟ کیا فرشتوں کا استاد بھی تھا؟ میں نے کہا نہیں قرآن میں ہے وکان من الجن، پھر فرمایا کیا کچھ فرشتے آگ سے پیدا کیے گئے تھے اور ابلیس بھی ان میں سے تھا؟ میں نے کہا نہیں فرشتے صرف نور سے پیدا ہوئے ہیں جبکہ ابلیس آگ سے، پھر فرمایا کیا آدم کو پھسلانے کے لیے ابلیس سانپ بن کر جنت میں گیا تھا؟ میں نے کہا نہیں یہ تو درست ہے کہ ابلیس کوئی سا بھی روپ دھار سکتا ہے، مگر وہ جنت سے خروج کے بعد دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا اور اگر داخل ہو گیا تو پھر یہ دخول دائمی ہوگا، وہ باہر نہیں آسکے گا، اگر ابلیس نے جنت میں جا کر آدم وحوا سے کچھ کہا ہوتا تو قرآن میں فقال لهما الشيطن ہوتا جبکہ قرآن میں فاز لهما الشيطن اور فوسوس اليه الشيطان ہے، جس طرح وائرلیس سے ریڈیائی لہروں کے ذریعے دوسرے بندے کو پیغام پہنچایا جاتا ہے اسی طرح شیطان نے بھی جنت سے باہر رہ کر وسوسہ جیسی لہروں کے ذریعے اپنی بات آدم وحوا سے کی ہوگی میرا جواب سن کر حافظ صاحب فرمانے لگے، میں ڈیڑھ گھنٹے سے اسی پہ دلائل دے رہا ہوں کہ ابلیس نہ فرشتہ تھا نہ فرشتوں کا استاد تھا، اور حضرت سعید بن جبیر کا یہ قول کہ بعض فرشتے آگ سے تخلیق کیے گئے تھے غیر صحیح ہے اور ابلیس کسی بھی صورت میں جنت میں نہیں گیا۔ حافظ صاحب کا ڈیڑھ گھنٹے تک اس عنوان پہ دلائل دیتے رہنا میرے لیے حیران کن اس لئے نہیں تھا کہ میں ان کی علمی وسعتوں سے واقف تھا اور وہ واقعی بحر العلوم تھے۔

حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات سے چند ماہ قبل میں نے ان کی خدمت میں جانا کم کر دیا تھا۔ اور اس کا سبب میں نے دیگر دوستوں کے علاوہ ڈاکٹر محمد شکیل اوج اور مولانا عبد الکریم سیالوی (جامعہ باب القرآن) کو بھی بتایا تھا۔ اور اب سب کو بتا رہا ہوں کہ حافظ صاحب مرحوم بہت ہی درد مند دل کے مالک تھے، دوستوں کو تکلیف میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے، میں ذاتی طور پہ جانتا ہوں کہ حضرت موصوف نے کتنے ہی علماء اور مدارس دینیہ کی ان کی توقع سے بڑھ کر مدد کروائی تھی۔ یکم نومبر ۲۰۰۶ کو ایک دار العلوم کی اختتامی تقریب سے واپسی پہ مجھے روڈ پر گاڑی کے انتظار میں کھڑا دیکھ کر تڑپ اٹھے، پھر رات کو نو بجے فون کر کے فرمایا کہ میں تمہارے لئے کسی سے کہہ کر گاڑی کا انتظام کرواتا ہوں۔ لیکن انکار نہیں سنوں گا، پھر ان کی صحت روز بروز گرتی رہی اور عمر بھی ۸۷ برس پہ پہنچی ہوئی تھی، میں نے اسی لیے حاضری کم کر دی تھی کہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ میں اسی مطلب سے آتا ہوں، البتہ ٹیلیفون پر رابطہ جاری رہا اور میں یہ بات جانتا ہوں کہ اگر میں اپنی حاضری حسب معمول رکھتا تو وہ اپنی بیماری بھول کر میری تیمارداری میں لگ جاتے۔

حافظ محمود الحسن صاحب قرآن مجید کا فہم و ادراک رکھنے والے عالم دین تھے اور پھر پاکستان میں

تھے جہاں قرآن کا علم رکھنے والوں سے محبت کم نفرت زیادہ کی جاتی ہے۔ اگر یہ فنکار ہوتے تو حکومت ان کا علاج کرواتی اور ان کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے بچوں کیلئے مالی امداد یا نوکری کا انتظام کرتی لیکن حافظ صاحب تو قرآن کے عالم تھے؟ ان کی معنوی اولاد تو بجز سینکڑوں تلامذہ کے کوئی نہیں۔ البتہ سائیکالوجی میں ایم اے ان کی تعلیم یافتہ اکلوتی صاحبزادی کو حکومت یا کوئی ادارہ باوقار نوکری کیوں دیں گے؟ کیا یہ سوالیہ نشان ہمیشہ سوالیہ ہی رہے گا؟

بہر حال اب سورج کی طرح چمکتا ہوا حسین چہرہ تو میری نظروں سے چھپ گیا ہے مگر میرے بچوں کو اور مجھے دی گئی ان کی دعاؤں میں سے یہ الفاظ میرے دماغ میں گونج رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپکے بچوں کے مستقبل کو حسین بنائے، انہیں زمینی اور آسمانی آزمائشوں میں کامیاب فرمائے، اللہ تعالیٰ غربت، تنگدستی و مفلسی سے بچائے، اپنے علاوہ کسی کا دست نگر نہ بنائے، ایمان کی سلامتی عطا فرمائے، اللہ حافظ و ناصر السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ والباقی عند اللاقی۔ ملاقات کے ساتھ نہیں۔ ٹیلیفون پر یہ آخری جملے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی زوجہ محترمہ اور صاحبزادی صاحبہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کے جملہ متوسلین کو بھی صبر و ہمت عطا کرے۔

جامعہ کراچی کے آخری ایمریٹس

پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام (مرحوم)

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

معروف مؤرخ ڈاکٹر ریاض الاسلام مختصر علالت کے بعد ۱۳ اگست ۲۰۰۷ء بروز پیر، اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اٹھاسی (۸۸) سال تھی۔ بطور پروفیسر، وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے گزشتہ کئی دہائیوں سے وابستہ تھے۔ جامعہ کے یہ آخری ایمریٹس (Emertaus) پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب ۳۰ دسمبر 1919ء گورداسپور (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ علیگڑھ یونیورسٹی میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں انہوں نے تاریخ سے بے پناہ رغبت کے باعث اس میں کچھ کرنے کا داعیہ اپنے اندر محسوس کیا اور یہی "داعیہ" پھر ان کی پہچان بن گیا۔ وہ تاریخ کے مضمون میں ڈبل پی ایچ ڈی ہوئے۔ پہلا پی ایچ ڈی 1946ء میں علی گڑھ سے کیا، جب کہ دوسرا 1956ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے جہاں ان کے مقالے کا عنوان تھا۔

"Diplomatic relations between the Mughal Emperors of India and the Safawid Shahs of Iran"

ڈاکٹر صاحب نے کراچی یونیورسٹی کا ہسٹری ڈپارٹمنٹ 1953ء میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر جوائن کیا۔ غیر ملکی جرنلز میں ریسرچ آرٹیکلز کے علاوہ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں Sofism in South Asia کے زیر عنوان بہت عمدہ اور اعلیٰ تحقیقی معیار کی حامل کتاب لکھی۔ اس کتاب کے تعلق سے راقم کو ڈاکٹر صاحب سے براہ راست گفتگو کا شرف بھی حاصل ہوا۔ گو ڈاکٹر صاحب سے بہت کم ملاقاتیں رہیں، پہلی ملاقات اس وقت ہوئی، جب میری ایک اسٹوڈنٹ (شیما ربانی لیکچرار گورنمنٹ کالج کراچی) کے پی ایچ ڈی کے عنوانِ مقالہ پر بی اے ایس آر (بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ) نے رفع اعتراض کے لئے ایک کمیٹی بنائی اور بحیثیت سپروائزر مجھے پابند کیا کہ میں ڈاکٹر ریاض الاسلام کی مشاورت سے یہ کیس بی اے ایس آر کو دوبارہ دوں۔ بس اور یہی وہ موقع تھا، جب میں پہلی بار ڈاکٹر صاحب سے ملا اور تصوف کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی مذکورۃ الصدر کتاب کا پتہ

چلا۔ عنوان مقالہ جات کی تعیین پر ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ عنوان کا تعین کرتے وقت دیکھ لینا چاہئے کہ موضوع کی وسعت اور گہرائی کتنی ہے؟ نیز وسعت و گہرائی میں تناسب کیا ہے؟ ان میں اگر کسی بھی ایک چیز کو نظر انداز کیا جائے تو اسے تحقیق کا عنوان نہیں بنانا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ تحقیق کار کو محدود دائرے میں کام کرنے کا موقع دینا چاہئے تاکہ وہ صحیح معنی میں تحقیق کر سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ دائرۂ تحقیق کو بلاوجہ پھیلانے سے تحقیقی عمل متاثر ہوتا ہے۔ یہ مشاورت یقیناً اہم تھی، کیونکہ میری اسٹوڈنٹ کا عنوان تھا۔ "تاریخ اقوام و مذاہب کی روشنی میں تصورِ تصوف" اور اس عنوان پر ڈاکٹر صاحب کو یہی اعتراض تھا کہ وہ بہت پھیلا ہوا ہے، اسے محدود کیا جائے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی کے بعد اب وہ عنوان، اس عنوان میں تبدیل ہوگیا۔ "تاریخ اسلام کی روشنی میں تصوف کا ارتقاء"۔ یعنی یہ بالخصوص اور ایسا محدود ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ جس میں خطے کی متحرک ثقافت اور تواتر سے منتقل ہونے والی وراثت کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے یہ واضح ہو کہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لئے ۵۰ء اور ۶۰ء کی دہائیوں میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کتاب "تاریخ ہند و پاک" شامل نصاب رہی ہے۔ 1979ء میں ڈاکٹر صاحب کی ایک تحقیق اور منظر عام پر آئی۔ جو ایران میں کی گئی تھی اور عنوان تھا۔

A Calendar of Documents on INDO-PERSIAN reliations

(1500 - 1750)

اس کتاب کی پہلی جلد راقم کے پاس موجود ہے جو بڑے سائز کے 511 صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ کے کثیر اللسان محقق جانے جاتے تھے۔ اور Ku's Insitute of Central and West Asian Studies کے بانیوں میں سے تھے اور تاحیات سیکریٹری بھی۔ ان کے انتقال پر نہ صرف جامعہ کراچی بلکہ ان کے مضمون سے وابستہ پاکستان کا تمام علمی حلقہ سوگوار ہے۔ 14 اگست 2007ء کو بعد نماز ظہر، جامع مسجد ابراہیم (جامعہ کراچی) میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامعہ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

نام کتاب: تفہیم المسائل جلد سوئم
تحقیق وتصنیف: پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمن
سن اشاعت: اپریل 2007
صفحات: 502، قیمت: -/250 روپے
ناشر: ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور

مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین اہلسنت کے ہزاروں مدارس کے امتحانی بورڈ تنظیم المدارس کے صدر اور اسی مکتبہ فکر کی جماعتوں اور تنظیموں کی رہبر کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمن صاحب کی مصروفیات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، پھر بحیثیت دارالعلوم نعیمیہ میں کل وقتی اور سفیر اسلام و مسلمین اندرون و بیرون ملک کے سفر مختلف مسائل و معاملات پر سرکاری غیر سرکاری، مسلم غیر مسلم وفود، افراد اور تنظیموں سے بحث و تمحیص جیسی اضافی مصروفیات کے باوجود قلم بدست رہنا اور 502 صفحات پر مشتمل تفہیم المسائل کی تیسری جلد کا عوام و خواص کو تحفہ دینا لائق تحسین ہے۔ مفتی صاحب کی شخصیت قدیم و جدید علوم کا حسین امتزاج ہے، اخیار و اخیار اہل علم ان کی اصابت رائے، مسائل میں گہری نظر اور علمی و فکری صلاحیتوں کے قلب کی گہرائیوں سے معترف ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ مفتی صاحب تفسیر سورۂ نساء کی طرز پر ان شاء اللہ قرآن مجید کی مکمل تفسیر کا تحفہ ملت اسلامیہ کو ضرور عنایت فرمائیں گے۔

تفہیم المسائل کی یہ تیسری جلد تیرہ ابواب اور تیرہ ہی متفرق مسائل کے تفصیلی اور محققانہ جوابات پر محیط ہے، اس میں روایتی مسائل کے جوابات بھی ہیں اور ارتقاء پذیر عہد کی پیداوار جدید مسائل کے جوابات بھی۔ نیز بعض ایسے مسائل کہ جن کے بارے میں فقہ کے بنیادی ماخذ خاموش ہیں ان کے تفصیلی جوابات بھی ہیں، روایتی اور درایتی تمام مسائل و جوابات کا احاطہ تو ناممکن ہے البتہ چند ایک کا اشاریہ پیش خدمت ہے۔

کتاب العقائد میں، غیر صحابی کیلئے رضی اللہ عنہ کہنے کے جواز پر، قرآنی آیات، روایات اور اقوال فقہاء کے ذخیرہ سے مدلل جواب تحریر فرمایا ہے اور نتیجہ میں فرمایا ہے کہ رضی اللہ عنہ، رحمۃ اللہ علیہ، رحمہ اللہ تعالیٰ، غفر اللہ لہ، غفرلہ، عفا اللہ عنہ اور عفی عنہ جیسے کلمات اللہ کے مکرم و مقرب بندوں کیلئے ڈگریاں نہیں بلکہ یہ کلمات دعا، ہیں۔ البتہ صحابہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعزازات و انعامات ہیں، البتہ صحابی، غیر صحابی کیلئے یہ کلمات بلا تفریق کہے اور لکھے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح کتاب الصلوٰۃ میں ہر بڑے اور گنجان آباد شہر میں نمازیوں کو درپیش ایک اہم مسئلہ کی

عقدہ کشائی کی گئی ہے کہ چھوٹی سی جگہ پر تعمیر شدہ کئی منزلہ مسجد میں جب امام فرسٹ یا سیکنڈ فلور پر امامت کے فرائض انجام دیتا ہے اور نمازی گراؤنڈ فلور پر شریک جماعت ہوتے ہیں تو امام کے تفوق اور نمازیوں کی سفلیت میں واضح تفاوت سے اقتداء جائز ہے یا نہیں؟ تو مفتی صاحب نے اپنی تحقیق انیق سے نمازیوں کی شرکت جماعت کو جائز قرار دیا ہے اسی طرح نماز قصر کے حوالے سے دو سوالات کے جوابات اسلاف کی معاونت میں مگر انداز جدید میں اس طرح دیئے گئے ہیں کہ ہر مسافر آسانی مسافت قصر کا تعین کرسکتا ہے۔ یعنی مسافت قصر اٹھارہ فرسخ کو پہلے گزوں، میلوں اور پھر کلو میٹر میں بتا کر جہاں مفتی نظام الدین شامزئی کے پیدا کردہ ابہام کو دور کیا گیا ہے وہاں حیدر آباد کے جس مفتی نے 92 کلو میٹر کو مسافت قصر قرار دیا تھا، اسے بھی غیر صحیح قرار دے کر صحیح مقدار تحریر کردی ہے جو کہ یہ ہے 54 میل شرعی جو ایک لاکھ آٹھ ہزار گز یعنی انگریزی اکسٹھ میل دو فرلانگ بیس گز ہیں اور یہ اٹھانوے اعشاریہ سات تین چار (98.734) کلو میٹر کے برابر ہے۔ تفہیم مسئلہ میں یہ جدید طریقہ اجتہاد کی ایک شاخ ہے جس پر مفتی صاحب کو یدطولیٰ حاصل ہے۔۔۔۔۔ اسی باب میں ایک اور اہم مسئلہ بھی موجود ہے جو حالات حاضرہ کے تناظر میں زبان زد عام و خاص ہے یعنی بغیر لیز یا الاٹمنٹ کے سرکاری زمین پر مسجد کی تعمیر اور اس کی شرعی حیثیت؟ مفتی صاحب نے جو مدلل فتویٰ جاری فرمایا ہے وہ ان کی فقاہت اور بالغ نظری پر شاہد ہے کہ گورنمنٹ خود کوئی ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کرتی ہے یا پرائیویٹ سیکٹر کو ہاؤسنگ سوسائٹی کیلئے زمین مہیا کرتی ہے مگر دونوں صورتوں میں مسجد کیلئے کوئی جگہ نہیں رکھی، پھر ان سوسائٹیز کے مکینوں نے کسی بھی خالی جگہ پر مسجد قائم کرلی، بعد ازاں سرکار نے اپنے نقشہ جات یا لے آؤٹ پلان میں اس جگہ پر مسجد دکھادی تو وہ جگہ مسجد کیلئے مختص شمار ہوگی چاہے گورنمنٹ سوسائٹی کو مسجد کی جگہ لیز یا الاٹمنٹ جاری کرے یا نہ کرے، ایسی مسجد میں نماز جائز ہے۔ ایسی مسجد کو ختم کرنا یا شہید کرنا درست نہیں۔

اسی طرح کتاب الجنائز میں بھی ایک اہم فتویٰ ہے کراچی میں میسی گھری قبرستان میں سینکڑوں قبور میں مدفون مرحومین کے ورثاء اس فتویٰ سے مدد حاصل کرسکتے ہیں، مفتی صاحب نے میت کی باقیات کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرنے کے حوالے سے احادیث مبارکہ اور اقوال فقہاء کی روشنی میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ مسلمان کی قبر کو کھودنا سخت حرام ہے، اسلامی سلطنت ہو تو ایسا شخص مستحق تعزیر ہے کیونکہ انتقال میت حرام ہے، اگر متعلقہ محکموں کے لوگ طاقت کے بل پر قبروں کو بلڈوز کرنا چاہیں تو بھی بلڈوز کرنے سے قبل قبر کو کھودنا اور باقیات میت کو نکال کر منتقل کرنا درست نہیں ہے۔

ساتویں باب کتاب الحج میں بھی ایک اہم ترین مسئلہ یعنی خواتین کا بغیر محرم کے سفر حج کا ایسا حل

لل جواب تحریر کیا گیا ہے کہ اسلاف کی مطابقت بھی برقرار رہی ہے اور فقیہانہ شان بھی ہویدا ہو گئی ہے کہ عورت محرم کے بغیر حج یا مطلقاً اتنے سفر پر نہیں جاسکتی کہ جس کی مسافت قدیم ذرائع سفر کے اعتبار سے تین دن پر محیط ہو اور وہ مسافت 98.734 کلومیٹر ہے، البتہ اس سے کم مسافت یعنی 97.5 کلومیٹر تک وہ بغیر محرم کے تنہا سفر کر سکتی ہے۔۔۔ مزید فرمایا کہ امام ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ عورت بغیر محرم کے کسی بھی صورت میں سفر حج نہیں کر سکتی۔۔۔۔ البتہ امام مالک کا فتویٰ ہے کہ عورت، عورتوں کے گروپ میں بغیر محرم کے حج فرض پر جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ خود کو محفوظ تصور کرے لیکن نفلی حج کیلئے نہیں جاسکتی۔۔۔۔ امام شافعی کا فتویٰ یہ ہے کہ عورت، عورتوں کی جماعت کے ساتھ فرض اور نفلی حج پر بغیر محرم کے جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ خود کو محفوظ تصور کرے۔۔۔۔ مفتی صاحب کے فتویٰ کے تناظر میں یہ راستہ مہیا ہو جاتا ہے کہ جب غیر حنفی مذہب پر بعض مسائل میں فتویٰ دینے کی اجازت ہے تو خواتین کے سفر حج کے حوالے سے امام مالک اور امام شافعی کے مذہب پر بھی فتویٰ دیا جاسکتا ہے اور حج گروپ قائم کرنے والی تنظیمیں اگر خواتین کا الگ گروپ قائم کر لیں اور معلمات بھی خواتین ہوں تو ایسی صورت میں حج سے محروم خواتین کو حج کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے نیز جس تحقیق سے تین دن سے کچھ کم کی مسافت تک خواتین کو تنہا سفر کی جو اجازت دی گئی ہے، اسی مسافت کو جدید ذرائع سفر سے طے کرنے کی اجازت میں بدل دیا جائے تو خواتین کیلئے یہ مزید سہولت ہوگی، کیونکہ جو عورت باوجود تمام تر خوف و خدشات و خطرات کے 97 کلومیٹر کا سفر وہ بھی قدیم ذرائع سفر کے مطابق اور پر از خطر راستوں پر بغیر محرم کے طے کر سکتی ہے وہ اس سے زیادہ سفر بھی کر سکتی ہے، اس پہلو پر اجتہاد کی مزید ضرورت ہے۔

اسی طرح کتاب النکاح میں مہر معجل اور مہر موجل کے بارے میں دریافت کیے گئے سوال کے جواب میں مفتی صاحب نے مہر کی تین قسمیں باوضاحت بیان فرما کر پس منظر میں نکاح خوانوں کیلئے اشارہ فرمادیا ہے کہ وہ نکاح پڑھاتے وقت فریقین کو مہر کے معاملات سے آگاہ کر دیا کریں (اس لیے کہ لوگ مہر معجل کو اتنا لٹکا کر رکھتے ہیں کہ مہر موجل اور مہر مؤخر تو درکنار بیوی کی موت کے بعد بھی ادا نہیں کرتے یا پھر اسے خلع کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں) لہٰذا نکاح خواں مہر موجل کیلئے میعاد کا تعین کرادیا کریں یا پھر موجل کو مہر مؤخر لکھوایا کریں، جس کی انتہائی میعاد موت یا طلاق ہے۔

نویں باب کتاب الطلاق میں تفویض طلاق کے حوالے سے مفتی صاحب نے بہت ہی جامع اور مفصل فتویٰ تحریر فرمایا ہے، قرآن مجید اس مسئلہ پر بالکل خاموش ہے، روایات سے کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا، پھر بھی مفتی صاحب نے اسلاف کی عبارات اور اقوال کے تتبع میں یہ واضح فرمایا ہے کہ جب تفویض

تبصرہ کتب — محمد اعظم سعیدی

طلاق کا معاملہ ہو تو ایجاب میں پہل لڑکی یا اس کے وکیل کی طرف سے ہو پھر لڑکا اس مشروط ایجاب کو قبول کرے تو یہ تفویض طلاق مؤثر ہے اور اگر تفویض طلاق دائمی اور غیر مشروط ہے تو عورت جب چاہے یہ اختیار استعمال کر سکتی ہے، شوہر یہ حق دے کر نہ واپس لے سکتا ہے اور نہ اسے باطل کر سکتا ہے، اس کے ساتھ ہی خلع اور فسخ نکاح میں فرق کے حوالے سے تفصیلی فتویٰ موجود ہے۔

علاوہ ازیں تیرھویں باب حلال وحرام میں عصر حاضر کے ایک اہم مسئلہ پر مختصر مگر جامع فتویٰ موجود ہے یعنی پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ میں حکومت کی طرف سے جو اضافی رقم ملتی ہے وہ اگر شرائط ملازمت میں سے ہے تو جائز ہے اسی طرح حکومت جی پی فنڈ کے ساتھ جو اضافی رقم بطور فضل و احسان کے دیتی ہے تو وہ بھی درست ہے۔

اسی طرح آخر میں تیرہ متفرق مسائل کے جوابات ہیں جو کہ جامع و مفصل ہیں اور 86 صفحات پر محیط ہیں اگرچہ ہر فتویٰ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت ہی اہم ہے مگر حالات حاضرہ کے پیش نظر میرے نزدیک بیع اور برطانوی قانون، ہلال رمضان، یوم النحر و عاشورہ کی تعیین کیلئے قیاسات و تخمینی ضابطوں کی شرعی حیثیت جیسے مسائل بہت اہم ہیں، اس لئے کہ یہ عوام کو ہر وقت درپیش ہیں، لوگوں کو چاہئے کہ وہ ان فتووں سے رہنمائی حاصل کریں۔ علاوہ ازیں تحفظ خواتین بل کے حوالے سے بھی ایک مفصل فتویٰ موجود ہے، جس میں اس بل کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس بل کی تخلیق و ترتیب سے لے کر تکمیل تک دیگر علماء کے ساتھ مفتی صاحب بھی شریک رہے اور اپنے تحفظات کا بطور تحریر و تقریر برملا اظہار فرماتے رہے، اس بل میں جو سقم ہیں اور اس کی جو دفعات قرآن و سنت اور اخلاقیات کے منافی ہیں مفتی صاحب نے ان پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے اور قرآن و سنت کی روشنی میں اس بل پر اپنے خدشات و تحفظات کا اظہار کر کے اپنی دینی سفارت کا حق ادا کیا ہے۔

اسی طرح قتل ناحق کا شرعی حکم، مفتی صاحب کا وہ معروف فتویٰ ہے جس میں ہر مکتبہ فکر کے انسٹھ (59) مفتیان کرام کے تائیدی دستخط ہیں جبکہ بیروت کے دو اور ایران کے حوزہ علمیہ قم کے ایک مفتی صاحب کی توثیق و تصویب بھی موجود ہے، بہر حال تفہیم المسائل میں علم کا ایک وسیع خزانہ ہے جس میں قاری کو ہر نوع میں پیش آمدہ مسئلے کا جواب مل جائیگا، کتاب اعلیٰ کاغذ پر دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ چھاپی گئی ہے، اس کتاب کا حق ہے کہ اسے ہر گھر اور لائبریری کی زینت بنایا جائے۔

نام کتاب: مشرق وسطیٰ کا بحران
تحقیق و تصنیف: زیبا افتخار، محمد سہیل شفیق
سن اشاعت: مارچ 2007
صفحات: 529، قیمت: 380 روپے
ناشر: قرطاس پوسٹ بکس 8453
کراچی یونیورسٹی

زیر تبصرہ کتاب "مشرق وسطیٰ کا بحران" شعبہ تاریخ اسلامی جامعہ کراچی کے زیر اہتمام گذشتہ سال اسی عنوان پر منعقدہ دو روزہ کانفرنس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے جسے جناب سہیل شفیق اور محترمہ زیبا افتخار نے مرتب کیا ہے، اس میں شعبہ اسلامی تاریخ سے وابستہ صدر شعبہ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ سمیت مختلف اساتذہ کے سات مقالات بھی شامل ہیں یعنی مجموعی طور پر 8 اساتذہ کے مقالات ہیں جبکہ اسی شعبہ میں زیر تعلیم 5 طلباء وطالبات کے مقالات بھی موجود ہیں، ہم اسے حسن اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں کہ پانچوں طلباء وطالبات کے نام شین سے ہی شروع ہوتے ہیں، یہ تیرہ مقالات 232 صفحات پر محیط ہیں جبکہ ص 235 سے ص 384 تک پروفیسر حبیب الحق ندوی مرحوم کی نایاب کتاب "فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات" سے پانچ عنوانات منتخب کرکے اس عنوان کی تشنگی کو دور کیا گیا ہے، کتاب کے آخر میں ۹۱ صفحات پر محیط انگریزی حصہ میں مرتبین کے مشترکہ اداریہ، صدر شعبہ ڈاکٹر نگار سجاد کی مختصر نگارش، پروفیسر ایس ایم فضل اور پروفیسر ڈاکٹر تنویر خالد کے پیغامات کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ کیلئے امریکی رولز کے عنوان سے ڈاکٹر طلعت اے وزارت کے صدارتی خطبہ کو بھی شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر شائستہ تبسم، رابعہ ملک کے مقالات کے علاوہ جان میئر شیمر اور اسٹیفن والٹ کا ایک مشترکہ سلیکٹڈ مضمون بھی شامل اشاعت ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے اگرچہ بہت کچھ ہے مگر پیش لفظ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اور ڈاکٹر نگار سجاد صاحبہ نے اسرائیلی ریاست کے قیام کے نظریاتی پہلو کو جس طرح اجاگر کیا ہے اس سے نہ صرف آنکھیں بلکہ دل ودماغ کے کئی دریچے وا ہو جاتے ہیں، مشرق وسطیٰ میں یہودی ریاست کا قیام، عیسائیوں کی وہ شرارت ہے جسے یہودی بھی ارض موعود میں بسنے کی خوشی میں سمجھ نہ سکے یعنی شدت سے اپنے مذہب کی پیروکار یہ دونوں قومیں عیسائیت کی بچھائی ہوئی بساط پر لڑتی رہیں گی اور ہم محظوظ تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے۔ اسی پس منظر میں جملہ عیسائیت اسرائیل کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ جس کے باعث گذشتہ ساٹھ برسوں سے مشرق وسطیٰ جل رہا ہے، لاکھوں افراد تہہ تیغ اور لاکھوں خاندان برباد ہو چکے ہیں، امریکہ نے اپنی بدمعاشی کے بل بوتے پر مشرق وسطیٰ کے جدید نقشے میں مسلم

ممالک کی سرحدوں میں تبدیلی کرکے جلتی آگ پر مزید تیل چھڑک دیا ہے اور اس نقشہ میں پاکستان بھی قطع برید سے نہیں بچ سکا، بلکہ امریکہ نے تو پوری اسلامی دنیا کو شیعہ اور سنی ریاستوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

ڈاکٹر نگار سجاد کی یہ بات واقعی دل لگتی بات ہے کہ امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے تیار کردہ مشرق وسطیٰ کے جدید نقشہ سے طلبا کو آگاہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، کیونکہ ہماری سرکاری نصابی کتب میں جو تاریخ لکھوائی اور پڑھوائی جاتی ہے اس کا دنیا کے حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ بہرحال کتاب میں موقر مواد موجود ہے، طلبا اور درد دل رکھنے والے اہل علم کیلئے یہ کتاب وقت کا اہم تحفہ ہے، سہیل شفیق اور زیبا افتخار نے مقالات کی ترتیب وتدوین میں جو سعی کی ہے وہ قابل ستائش ہے، البتہ اس کتاب کی اشاعت ثانی میں پروف زیادہ توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے، کتاب اعلیٰ کاغذ پر اور مسجد اقصیٰ کی تصویر سے مزین خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ چھاپی گئی ہے، اہل علم اور طلبا اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں۔

نام کتاب: ایک علمی وفکری مکالمہ
ارباب مضامین: ابوعمار زاہد الراشدی۔
معز احمد۔ خورشید ندیم۔ ڈاکٹر فاروق خان
سن اشاعت فروری 2007
صفحات: 200، قیمت: 160 روپے
ناشر: الشریعہ اکادمی ہاشمی کالونی گوجرانوالہ

ابو عمار زاہد الراشدی کی علمی وفکری صلاحیتوں سے ارباب علم بخوبی واقف ہیں۔ موصوف ہر زیر قلم عنوان پر تحقیق کا حق ادا کرتے ہیں۔ اور دلداری کا عالم یہ ہے کہ مد مقابل کے بخیے ادھیڑتے ہوئے اسے خراش تک نہیں آنے دیتے۔ زیر نظر کتاب موصوف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو 2006ء میں مختلف اخبارات وجرائد میں گاہے بگاہے شائع ہوتے رہے ہیں۔ سن 2006ء چونکہ حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل کیلئے معنون تھا، اس لئے موصوف نے اس میں بھرپور حصہ لیا ہے اور مضبوط دلائل سے اپنی فکر کو دوسروں تک پہنچایا ہے۔

یہ کتاب مجموعی طور پر چھ فصول پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل کا پس منظر اور پیش منظر پر سیر حاصل بحث کے ساتھ ساتھ حدود آرڈیننس میں ترامیم کے پس منظر کو قلم کی زد میں لاکر یہ واضح کیا ہے کہ حدود اللہ بطور آپشن کے نہیں بلکہ بطور حکم کے ہیں ہمیں ان حدود کو اختیار کرنے اور نافذ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایسے رہنما، جو حدود الٰہیہ پر لاف زنی کر رہے ہیں ان کو ثبت و